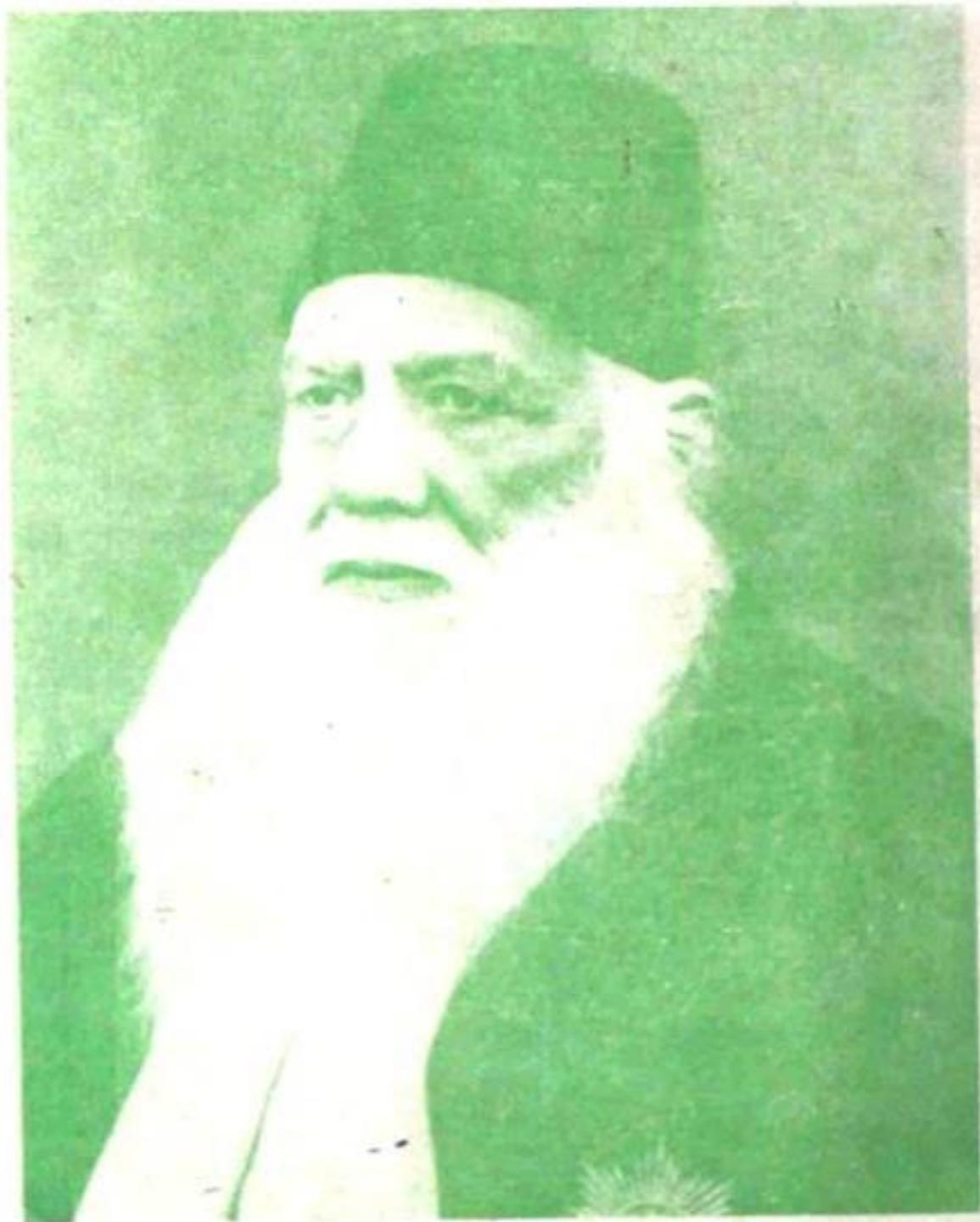




علی لہٰ تحریک



حشمت علی قریشی

علی گڑھ تحریک

(ایکے تقاضے)

از

عشرت علی قریشی

متوجہ

محمد ضیاء الدین انصاری



شائع کردہ

شہر کے رابطہ عامت

علی گڑھ مسلمہ مُونیپورسٹی علی گڑھ

مُسْلِمْ اِيجو کیشنل پریس علی گڑھ

می توں قطب زماں شد؛ می توں شد غوث وقت
ہرچی خواہی می تواني شد، بجز النساں شدن
چیست الناسی؟ تپیدن در عزیم ہمسایگاں
از سومونج در بارغ عدن بریاں شدن
خوار دیدن خویش را از خواری اباکے جنس
در شبستان نگ دل از محنت زندان شدن
زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گرتوانی می تواني سیداحمد خاں شدن
(الطاف حسین حائل)

پیش لفظ

) اقبال نے کہا ہے۔ ۶)

”پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ“

جو ٹہنیاں شجر سے علیحدہ ہو جاتی ہیں وہ فنا کو دعوت دینی ہیں۔ علی گڑھ تحریک (جو اس کتاب کا موضوع ہے) ہمارے ماضی کے ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

جو لوگ سوئے ہوتے تھے وہ بیدار ہوتے اور کارواں جادہ پیماں ہو گیا۔ افسوس ہے کہ کارواں نے تھوڑی دُور جا کر سمت بھی کھو دی اور رفتار کھی۔ کیا عجب کہ اُس تحریک کا ذکر ہمیں اس کے احیاء پر آمادہ کرے۔ اگر ایسا ہوا تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ فاضل مصنف کی کوشش رائیگان نہیں گئی۔

سید حامد
دائیں چانسلر

علی گڑھ
۱۹۸۱ء اکتوبر

تعارف

انیسویں صدی کا نصف آخر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا انتہائی پُر آشوب اور صبر آزمادور تھا۔ بیمار و نجیف مسلم معاشرہ جو عرصہ دراز سے جہل، قدامت پسندی، روایت پرستی، کوران تقلید، اسلام کی روح سے بیگانگی، نفاق و عداوت، ہو و لعب اور دوسرا سے جہلک امراض میں مبتلا تھا، اب سیاسی اقتدار چین جانے کے بعد زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا۔ غدر کی ناکامی نے مسلمانوں پر قیامت توڑ دی تھی۔ عہد و سلطی کی تہذیب کا قصر منہدم ہوا رہا تھا۔ معاشی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور مسلمان پتی وزوال کی انتہائی سطح پر پہنچ چکے تھے۔ مایوسیوں کے تاریک فہمیں سائے دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر طرف گھٹاؤپ انڈھیرا تھا۔ امید کی کوئی کرن نظرنا آتی تھی۔ یہ تاریخ کا ایک خطناک موڑ تھا۔ ایسا موڑ جہاں پہنچ کر اگر منزل کا تعین اور صحیح راستہ کا انتخاب نہ ہو سکے تو قومیں ابدی نیند سوکرتاریخ کے دھنڈ لکوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتی ہیں۔ ضرورت تھی کسی عظیم رہبر کی جو ملت اسلامیہ ہند کی صحیح منزل کی طرف رہنمائی کرے کسی میجاۓ زماں کی جو جاں بلب معاشرہ کے عوارض کی تشخیص کر کے صحیح علاج کرے کہی تحریک کارا اور ہوشمند ناخدا کی جو ذلت و رسوانی کے گرداب سے مسلمانوں کی کشتی نکال کر کنارے لگا دے۔ قدرت نے سر سید کو اسی رہبری، اسی میجانی اور اسی ناخداگی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کی تجدیدی تحریک نے نیم مردہ مسلم معاشرہ کو حیاتِ نوجہتی اور دو رجدید کے چینچ سے بزد آزمائے کے قابل بنایا۔ تاریخ کے دھارے کے رُخ کو موڑا۔ صحیح منزل کا تعین کر کے صحیح سمت رہنمائی کی۔ سر سید کی یہ انقلابی اور ہمہ جہتی تحریک آگے چل کر علی گڑھ تحریک کھلائی۔ اور مسلمانانِ ہند

کی نشانہ کا موجب بنتی۔ ملت کے اس دور کی ساری تاریخ دراصل اسی تحریک کی تاریخ ہے۔ یہ مختصر کتابچہ علی گڑھ تحریک پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد بس طلباء کو تحریک کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرنا ہے۔ گزشتہ سال والی چانسلر صاحب کے حکم سے ایک کتابچہ انگریزی میں تحریر کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کا عنوان ”علی گڑھ تحریک“ تھا۔ لیکن اس میں ملی گڑھ تحریک پر مضمون کے علاوہ اُن اکابر علی گڑھ کے سوانحی خاکے بھی شامل تھے جن کے اسماء گرامی سے یونیورسٹی کے مختلف رہائشی ہال موسم ہیں۔ اس سال علی گڑھ تحریک پر یہ کتابچہ سال گذشتہ کے انگریزی مضمون پر فروزی اضافوں کے ساتھ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ترجمہ میکر فیق کاریجنسیاء الدین الفصاری صاحب اپنچارج شعبہ مخطوطات نے کیا ہے اور بعض مقامات پر اضافے بھی کئے ہیں۔ جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

گزشتہ سال سے یوم سرید کی تقریبات یہ ایک نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ والی چانسلر صاحب کی توجہ سے ملت اور قوم کے اس محسن کو تقریری خراج عقیدت کے ساتھ تحریری خراج عقید کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ چنانچہ اس سال کی اساتذہ کرام نے سرید پر انگریزی اور اردو میں بضایم بکھے ہیں جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوں گے۔ میں والی چانسلر صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ مجھے انہوں نے یہ شرف نہ صرف تھچلے سال بلکہ اس سال بھی بخشنا کہ میں سرید کے حضور اپنا نذر آنے عقیدت پیش کروں۔

آخر میں اپنے دوست اکرام اللہ خاں صاحب پبلک رلیشنز آفیسر کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جن کی توجہ اور تجھی سے یہ کتابچہ بہت کم وقت میں چھپ کر تیار ہوا۔

عشرت علی قریشی

ڈپٹی لائبریری恩

علی گڑھ تحریک

ہندوستان میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے او اختر تک مسلم معاشرہ پر انحطاط اور جمود کے گھنے بادل چاگئے تھے۔ تو ہم پرستی، قدامت پرستی، روایت پرستی اور جہل نے پورے معاشرے کو جکڑ لیا تھا۔ اور وہ معاشرہ جو مغلیہ ہند حکومت میں پروان چڑھا تھا اور جس کے غافر ترکی میں بہترین اسلامی روایات شامل تھیں، اب اس کا شیرازہ کھڑا جا رہا تھا اور یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اس میں زندگی کی رُنق باقی نہیں رہے۔ اس کی قوت، جوش، دلولہ اور تخلیقی صلاحیت سلب ہو چکی ہے۔ یہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان پر سلطنت سے پیدا ہونے والے چینج کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ہمت ٹکن اور مایوس کن حالات میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی اصلاحی اور تجدیدی تحریک کا آغاز کیا اور معاشرہ کو انحطاط اور تنزل کے قدر مذلت سے بکالنے کی کوشش کی۔ آپ نے جذید خیالات، نئی روشنی اور بدلتے ہوئے حالات کا چینج قبول کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کو از سر نو پیش کیا اور باہمی نفاق و نفرت کو دور کر کے اصلاح معاشرہ کا پیڑا اٹھایا۔

۱۷۰۰ء میں اور نگزیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا شیر بکھر گیا اور ملتِ اسلامیہ سیاسی پستی، معاشی بدحالی، اور ذہنی غلامی کا شکار ہو گئی۔ اگرچہ اس کے بعد مزید ڈیڑھ سو سال تک مغلیہ سلطنت برقرار رہی، لیکن عملی طور پر انگریزوں کا سلطنت رہا اور ہندوستان پر غلامی کے بادل منڈلاتے رہے۔ اور نگزیب کے جالشینوں میں کوئی بھی حکمران جہاں بانی کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے ہندوستان کی سیاسی فضائی انتشار اور عدم استحکام

کی آلو دگی سے مکدر ہوتی گئی۔ ایسے حالات میں ضرورت بھی ایسی قوت کی جوان باطل زنجروں کو توڑ کر پھینک دے اور ملتِ اسلامیہ کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرے۔ اللہ نے اس عظیم فرض کی ادائیگی کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی کو منتخب کیا۔ بقول شیخ محمد اکرم :

”وہ [شاہ ولی اللہ] آن عیوب اور کوتا ہیوں سے پوری طرح واقعہ تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انھیں یہ روز بددیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انھیں پوری طرح بنے نواب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی اختلافات کا مٹانا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنی میں ایک جماعت بن سکیں اور آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ان کی تمام کوششوں اس پر منعطف رہی ہیں۔“

شاہ صاحب کے بعد آپ کے فرزندان گرامی اور بالخصوص شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس مشن کو آگے بڑھایا اور ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و تبدیلی کی جوشمع شاہ صاحب نے رون کی تھی اس سے عوام و خواص کے قلوب کو منور کرنے کا کام انجام دیتے رہے۔ ۱۸۰۳ء میں اس تحریک نے سیاسی زمگ اختیار کر لیا۔ جب ”سقوط دہلی“ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا قتوں صادر کر دیا۔ اس تحریک کی ایک ہم کڑی ”جماعت مجاہدین“ ہے جس کی قیادت شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی کے صاحبزادہ شاہ اسماعیل شہید کر رہے تھے۔ آپ نے سید احمد شہید بریلوی کی قیادت میں ولی الہی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی اور ۱۸۳۰ء کو جنگِ بالا کوٹ میں جامِ شہادت نوش کی۔ بقول مولانا غلام رسول جہسر :

”جب ہندوستان میں سیاسی اقبالِ مندی کا آفتابِ غروب ہو چکا تھا اور ہر طرف مالیوسی و نو میدھی کی ظلمتِ مسلط بھی تورائیے بریلی کے ایک مجاہد سید نے بے سروسامانی کے باوجود طاقت کے اٹھا کا کتنا عظیم الشان انتظام کر دیا تھا اور ان کی برکت سے غیرت و محیتِ دینی کی ایسی آگ روشن ہو گئی تھی جس نے ہندوستان کے اندر اور باہر جگہ جگہ حیات کے وسیع ذخیرے ہمیا کر دیے تھے۔ ان کے ارادتمندوں نے اس روشنی کو مستقل اور پائیدار

بنانے کے لئے اثیار و قربانی کے کتنے حیرت انگر نونے پے در پے پشی کئے جو اسلام کے باکل ابتدائی دور کا بہترین پرتو تھے۔ جس فرض کی بجا آدری ہے وقت کے حکماء اور تاجدار اور اصحاب خزان و عساکر محروم رہے، اس کا عمل یہے شخص کے ہاتھ سے بلند ہوا جس کے پاس دنیاوی ساز و سامان کی کوئی چیز موجود نہ تھی یہ

اس کے علاوہ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی طرف سے جبکی بھی سیاسی و معاشرتی تحریکیں چلائی گئیں وہ سب شاہ صاحب کی اسی تحریک سے متاثر تھے اسی میں مولانا حاجی شریعت اللہ اہل حدیث کی فرانسی تحریک اور بریلوی مکتب فکر کی اہل قرآن تحریک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر شاہ صاحب کی تحریک سے ہی فیضان حاصل کیا ان تحریکوں نے بھی اپنے اپنے مخصوص دائرہ کار میں رہتے ہوئے مسلم معاشرے کی اخلاقی اور رہنمائی حالت سدھارنے کی جدوجہد کی اور ایسے وقت میں خود اعتمادی اور خود شناسی کی فضایا کرنے کو شش کی جب ہر طرف مایوسی اور نا میدی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن ان تحریکوں کو پوری طرح اپنے مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ فیماں ازل نے یہ سعادت سریداً حمد خان کے مقدار میں لکھدی تھی کہ وہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کی تحریک کو بڑھائیں اور اسے کامیابی کامانی سے ہم کار کریں۔ سرید نے مسلم معاشرہ کو عہد و سلطی کی کورانہ تقلید، قدامت پسندی اور روایت پرستی کی تک و تاریک راہ سے نکالا اور ایسی شاہراہ پر لا کر کھڑا کیا جو ایک طرف تو اسلام کے بنیادی عقاید سے مطابقت رکھتی تھی اور اسی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات اور جدید تقاضوں کی طرف بھی رہنمائی کرتی تھی۔

۸۵ء کی تباہی

مسلمانوں کی یہ زبوب حالی اور معاشرہ میں انحطاط و تنزل در اصل پشی خیمه تھی ایک بڑے انقلابی طوفان کا جو، ۱۸۵۷ء میں ”عذر“ کی شکل میں منودار ہوا۔ یہ بغاوت بڑی حد تک تاریخ کے دھارے کے رُخ کو پلٹنے کی ایک ناکام کوشش تھی جو انتہائی نامساعد حالات اور محض مایوسی و نومیدی کے عالم میں کی گئی تھی۔ ملک میں اس وقت جو حالات تھے اور مسلمانوں میں جو ایک عمومی تنزل پیدا ہو گیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ یہ بغاوت ناکام ہو جائے۔

اس عہد کے مسلم مردہ معاشرہ کے مقابلہ میں انگریز ایک ترقی پذیر قوم کی تمام خصوصیات سے متصف تھے۔ جدید علوم کی روشنی، صنعتی ملکناوجی اور جنگی اسلو میں ہر طرح اپنے مقابلے سے برتر تھے۔ وہ جدید سماجی تقاضوں کا واضح تصور رکھتے تھے اور صنعتی انقلاب و فرانسیسی انقلاب جیسے اہم اور تاریخ ساز واقعات کے محنت مندرجات سے ملا مال تھے۔

اگرچہ غدر کی ناکامی کے مصائب ہندوستانی سماج کے تمام طبقوں کو برداشت کرنے پڑے لیکن چونکہ مسلمان اس میں پیش پیش تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کو ان اثرات کا زیادہ شکار ہوا پڑا۔ انگریز قوم اس حقیقت سے بخوبی واقع تھی کہ اس بغاوت، کی تیاری مسلمانوں نے کی تھی۔ بعد میں شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ اور عوام کے دل میں انگریزوں کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا کرنے میں علماء کی جدوجہد نے انگریزوں کے اس یقین کو مزید تقویت پہنچائی۔ اس لئے ہر طرح کے ظلم و تشدد میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی خصوصیت برقراری گئی۔ ان یہ خوف دہراں کا بازار گرم کیا گیا اور ہزاروں مسلمان جن میں شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے تھے تینگ کئے گئے، تختہ دار کی زینت بنائے گئے اور پوری مسلم قوم کو شک و شہہ اور حقارت و نفرت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے جس سے وہ ناٹنی شہینہ کو بھی محتاج ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو کبھی "مستبدین بزم ہتھی" تھے اب رات کی تاریکیوں میں گداگری پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح پوری مسلم قوم کا مستقبل تاریکہ ہو گیا اور کہیں سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

غدر کی ناکامی بڑے دور رسم تاریخ کی حامل تھی۔ یہ محض ایک حکومت کا خاتمه اور دوسری حکومت کی ابتداء نہ تھی بلکہ ہندوستانی عوام کی سیاسی، ذہنی اور معاشی غلامی کا پیش خیمہ تھی یہ اپنے جلو میں ہندوستانیوں کے لئے مصائب و آلام کا ایک لامتناہی سلسلہ لائی تھی۔ اس ناکامی کے بعد متوں تک قتل و فحاشتگری کے مناظر دیکھنے میں آتے رہے۔ اسی کے ساتھ مسلم معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور ان کا عہد و سلطی کے طرز پر تعمیر کیا ہوا تہذیب کا قصر عظیم پر یک جنبش متہدم ہونے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک کا جاگیر دارانہ نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ حتیٰ کہ لوگوں کے مذہبی اعتقادات پر بھی ضرب کاری لگی۔ اس کے نتیجہ میں مایوسی و ناامیدی کی الیسی فضاظا طاری ہوئی کہ ان بد لئے ہوئے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے عوام نے عزالت نشینی اور فرار کی راہ اختیار کی۔ اس طرح پورے معاشرے میں ایک خلا رپیدا ہو گیا۔ ان حالات میں ضرورت

مختصر ایک ایسے آہنی شخص کی جو لوگوں میں بہت، جوش اور خود اعتمادی پیدا کرے اور کورانہ راسخ العقیدگی اور قدامت پرستی کو ترک کر کے جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اس عظیمہ کام کی انجام دہی کے لئے قدرت کی نگاہ انتخاب سر سید پر پڑی۔

سر سید خود بھی ان آلام و مصائب کا شکار ہوئے تھے۔ اور بہت سے دل ہلا دینے والے مناظر انپی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان تمام واقعات سے انھیں آنا صدمہ ہوا کہ متوفی رات کی تنہایوں میں بھی ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں اور بقول خود اس صدمہ میں ان کے سارے پال سفید ہو گئے لیکن آنکھوں نے بہت نہیں ہاری اور ایک سچے مصلح اور مفکر کی طرح غور و فکر کرتے رہے اور حالات کا تفصیلی جائزہ لیتے رہے۔

سر سید نے ہندوستان کی تاریخ کا گھرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی نظروں میں تمام تاریخی واقعات تھے ان کو معلوم تھا کہ ٹیپو سلطان جیسا جری اور بہادر سپا ہی اور اس کی جانشان فوج انگریزوں کے جدید تھیاروں کا مقابلہ نہ کر سکی تھی، نہیں سید احمد شہید بریلوی اور ان کی جماعت مجاہدین ان کے سامنے کا میاب ہو سکے تھے۔ لہذا سر سید اس نتیجہ پر پہنچے کہ انگریزوں کے خلاف مزید فوج کشی سے کچھ حاصل نہ ہو گا بلکہ عیل خود کشی کے مترادف ہو گا۔ ان کے خیال میں اب مسلمانوں کی فلاح و ہبہوں کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انگریز حکومت کے زیر سلط مسلم معاشرہ میں بہتری کی صورت پیدا کی جائے۔ ان کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن تھا جب مندرجہ ذیل طریقوں کو اپنایا جائے:

۱۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کی دیوار کو منہدم کیا جائے اور ان کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کو ختم کیا جائے۔ اس طرح دونوں اقوام میں تعلقات کو استوار کیا جائے۔

۲۔ عیسائی مشتریوں کے ہملوں سے اسلام کا تحفظ کیا جائے۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی از سرنو تشریح کی جائے اور ان کو جدید علوم، سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ کیا جائے جس سے تعلیم یافتہ مسلمان اسلام کے بنیادی عقائد پر قائم رہتے ہوئے نئے تقاضوں کو سمجھیں اور ان کے بارے میں معقول اور اعتدال پسندی کا روایہ اپنائیں۔

۴۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھنے کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ حکمران طبقہ کی برابری کر سکیں اور اتنی ملکی امور میں برابر کے شرکیں ہو سکیں۔

مسلم معاشرے سے ان خامیوں کو دور کیا جائے جو صدیوں سے جڑ پکڑ چکی ہیں۔ عوام کو تمدن کے صحیح مفہوم سے آشنائی کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ان کو مساویانہ مفت ام حاصل ہو۔

انگریزی کے ساتھ اردو کو ایک معادن زبان کا درجہ دلایا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو گے جب جدید علوم اور سائنس کی کتب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔

اس مشن کو کامیابی سے ہم کنار کرانے کے لئے سریں نے انتہک کوشش کی اور آئندہ چالیس سال تک اپنی عمر عزیز کا ایک ایک لمبے اس کے لیے وقف کر دیا۔ مسلم معاشرہ کی یہ اصلاحی اور تجدیدی تحریک "علی گڑھ تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کی مندرجہ بالا وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ ایک ہمہ گیر تحریک بھتی۔

۷ انگریز مسلم تعلقات

سریں ان دونوں قوموں میں مساویانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے ہمیشہ کوشش رہے اس سلسلہ میں انہوں نے دو میاذوں پر کام کیا۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کی طرف سے جونفرت بیٹھ گئی تھی اسے ختم کر کے دونوں میں یگانگت پسیدا کرنا۔ دوسرے انگریزوں کا مسلمانوں کی طرف جو جابران رویہ تھا اس کو ختم کر اکر دوسری اقوام کی طرح حکومت کے معاملات میں ان کو بھی مساویانہ حیثیت سے مشرک کرنا اور یہ بات بلا خوف تردید کریں گے کہ سریں بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

بغاویت کے بعد سریں نے سب سے پہلا کام "اسباب بغاوت ہند" کی تالیف کا کیا۔ ایسا کرنے میں انہوں نے ذریت اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈالا بلکہ اپنی جان کی بھی بازی لگادی۔ اس مختصر سے کتابچے میں انہوں نے مسلمانوں پر بغاوت کے اذامات کی پُرز و تردید کی اور یہ ثابت کیا کہ نہ تو مسلمان اور نہ ہی ہندوستانی قوم اس بغاوت کی ذمہ دار ہے بلکہ خود انگریزوں کی غلط حکمت عملی اس کی ذمہ دار تھی اُن کے خیال میں ہندوستانیوں کو قانون ساز کو نسل میں تائندگی نہ دینا بغاوت کی ایک بڑی وجہ تھی اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سر آکلینڈ کالون (SIR AUCKLAND COULON) اور جی۔ ایف۔ گرام (F. G. GRAHAM) جیسے انگریز دانشوروں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔ ایک عرصہ تک

اسے منتظر عام پر نہیں لا یا گیا بلکہ محض بُرش پارٹیٹ کے ارکان کو بغاوت کے حقیقی اسباب سے
داقت کرانے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے جو
غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کرنے کے لئے سر سید نے ایک اور رسالہ "خیر خواہان
مسلمانان" لکھا۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ مسلمان بنیادی طور پر انگریزوں کے مخالف نہیں
ہیں بلکہ انگریز حکومت کے بھی خواہ اور خیر انہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مسلمانوں
اور دیگر برادرانِ وطن کے بارے میں جن خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے اور ان کے لئے جو علمی
کلمات لکھے ہیں وہ مبالغہ پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ سب باقی حقائق کی روشنی میں بھی گئی ہیں۔ جن کا
ثبوت دستاویزوں سے پیش کیا جاسکتا ہے ۱۸۶۹ء میں انہوں نے ایک طویل مضمون "احکام
طعام اہل کتاب" لکھا جس میں انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں
کے لیے انگریزوں کے ساتھ کھانا اور ان کے باکھ کا ذیجہ جائز ہے۔ دراصل یہ ایک استفسار کا جواب
ہے جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ کیا مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا ازروے
شرعيت جائز ہے۔ سر سید نے اپنے جواب میں یہ بتایا کہ نہ صرف انگریزوں کے ساتھ بلکہ تمام اہل کتاب
کے ساتھ کھانا جائز ہے۔ اس کے علاوہ سر سید کا ایک زبردست کارنامہ ڈبلیو ڈبلیو۔ ہنٹر کی انگریزی
تصنیف "ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا ازروے ایمان مکہ معظمہ سے بغاوت کرنی فرض
ہے" پر طویل تبصرہ ہے۔ ہنٹر نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان انگریزی
حکومت سے جنگ کرنا اپنا مذہبی فرضیہ سمجھتے ہیں لہذا وہ انگریزی حکومت کے کبھی وفادار نہیں
ہو سکتے۔ اس کے خیال میں وہ بابت اور بغاوت ہم مدنی الفاظ ہیں۔ سر سید نے اپنے تبصرے
میں ہنٹر کی سخت گرفت کی اور ثابت کیا کہ مسلمان قرآن و سنت کی روشنی میں انگریزوں سے نہ تو جہا
کر سکتے ہیں اور نہ بغاوت بلکہ انگریز حکومت کی اطاعت و فراہداری اپنے فرض ہے۔ بقول مولانا عالی:

"انہوں نے اس روایویں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہاں کی
محض قرار تھی اول سے آخر تک اور وہ بابت کا اصول مشرح یا ان کے ہیں اور صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں اور
وہابی ہوں اب ہم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بد خواہی اور بغاوت جرم ہے جو شخص اس جرم کا مرکب ہو گا خواہ وہ وہابی ہو یا عیاشی
ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا بلکہ خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا۔"

مذہبی و معاشی تحریک اصلاحات

علی گڑھ تحریک کا ایک اہم پہلو نہ ہی اور سماجی اصلاحات میں۔ اسلام کی تعمیر

کے اہم کام میں سر سید نے شاہ ولی اللہ کو تحریک سے فیضان حاصل کیا۔ شاہ صاحبؒ ہندوستان میں علم اکلام کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے مذہبی امور میں اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا ہے سر سید نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانہ سائنس اور دینگ علوم عقلیہ کا ہے اور اگر اسلام کو ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے جدید تقاضوں کا مقابلہ کرنا ہے تو اس کی تعلیمات کی تشریح اس طرح ہونی چاہئے کہ اس میں جدید علوم و فلسفہ کی رعایت رکھی جائے۔ اسلام کے بارے میں سر سید کا یہ تصور تھا کہ اس میں آنی ہمہ گیری ہے کہ وہ ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا رکھتا ہے اور یہ کہ قرآن جو پوری انسانیت کے لیے ایک حصی ضابطہ حیات ہے، اس کی تعلیمات فطرت پسندی اور استدلال پر مبنی ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ مسلمان صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔ ان بدعات کی نشاندہی کر کے ان کو خارج کر دیا جائے نہیں ہے۔ اس لئے ہرورت اس بات کی ہے کہ ان بدعات کی نشاندہی کر کے ان کو خارج کر دیا جائے اور اسلام کی اصل روح کو پیش کیا جائے۔ سر سید نے یہ بھی دیکھا کہ اسلام دشمن طاقتوں بالخصوص نگزیر مشنوں نے اسلام کو منسخ کر کے پیش کیا ہے جس سے اسلام کی غلط تصویر عوام کے سامنے آئی ہے اور ولیم میور و دینگ نظر مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو پروپگنڈا کیا ہے، اس کے اثر سے مکران طبقہ میں اسلام کی تحریک و نفرت کا جذبہ ابھڑتے ہے۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مشنوں کی طرف سے عیسائی مذہب کی زبردست تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے ایک چلنگ ہے۔ یہ وہ تمام محرکات تھے جنہوں نے سر سید کو مذہبی و معاشرتی اصلاحات کے لیے مجبور کیا۔

< سر سید نے جب قرآن کی تفسیر کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان سے قبل مفترین نے جو کام کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جو جدید ذہن کو مطمئن کر سکے۔ ان تمام حالات کا جائزہ لے کر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دشمنان اسلام کا مقابلہ ان ہی تھیماروں سے کیا جائے جن کو وہ خود ستعال کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے استدلال پر مبنی نئے علم اکلام کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس طرح انہوں نے جو منطقی طرز کلام اختیار کیا وہ دو اصولوں پر مبنی تھا۔ ایک تو یہ کہ فطری قالزن خدا کا عمل ہے اور قرآن اللہ کا کلام۔ لہذا یہ بات عین فطرت ہے کہ دونوں میں کامل طور پر ہم آہنگی ہو اور دوسرے یہ کہ اگر علوم جدیدیہ کا کوئی پہلو قرآنی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا، تو یا تو وہ علم باطل ہے یا پھر اخلاق محسن ظاہری ہے۔ اگر اس کا عین مطالعہ کیا جائے تو وہ بھی قرآنی تعلیمات کے مطابق نظر آئے گا۔ سر سید کی تفسیر قرآن بلکہ ان کی تمام مذہبی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرقہ معتزلہ سے ٹڑی حد تک متاثر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں

میں اب رُشد اور امام غزالی کے نظریات کا بھی گہرا اثر نظر آتا ہے۔

مندہ بھی اصلاحات کے سلسلہ میں توریت و انجیل کی تفیر بھی سر سید کا ایک اہم کام ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ تمام آسمانی مذاہب برق ہیں اور ان سب کی بنیاد تعلیمات میں ہم آہنگی ہے۔ اس کی روشنی میں سر سید نے بائیبل کی تفیر لکھی۔ اسی کے ضمن میں انھوں نے قرآن اور بائیبل کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور ان مقامات کی نشاندہی کی جہاں ان دونوں آسمانی کتب کی تعلیمات و مفہماں میں مائلت پائی جاتی ہے۔ اردو میں اپنی توعیت کا یہ واحد کام ہے۔ اس سے ان کا مقصد اسلامی نقطہ نظر سے بائیبل کی تغیر و تشریح کرنا تھا تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو مندہ بھی غلط فہمیاں چلی آرہی ہیں ان کو دور کیا جاسکے۔

لیکن ان تمام کاموں سے زیادہ وقیع اور اہم تصنیف ان کی 'خطبات احمدیہ' ہے۔ میشہہ عیسائی عالم ولیم میور کی تصنیف "الْفَ آتِ مُحَمَّدٍ" (LIFE OF MAHOMET) کا جواب ہے۔ اس میں اس نے اسلام پر شدید نکتہ چینی کی بھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر بھی رکیک جملے کئے تھے۔ اس سے مسلمانوں کو قلبی اذیت پہنچی تھی۔ دوسری طرف عیسائی خوش تھے کہ اس میں بڑی چاکدستی اور ہدایتیاری سے اسلام کی بخشش کی گئی ہے۔ ولیم میور عربی زبان کا بھی عالم تھا اس لیے اس نے یہ اعتراضات اتنے مدلل طریقے پر کئے کہ ان کا جواب دینا بڑا مشکل کام تھا۔ سر سید نے اس اہم کام کا بڑا اٹھایا اور ان اعتراضات کا دندان شکن جواب دینے کا پختہ ارادہ کیا۔ لیکن جس تفصیل اور بڑے پیمانے پر وہ یہ کام کرنا چاہتے تھے اس کے لیے ہندوستان میں مکمل طریقہ تیار نہیں تھا۔ چنانچہ انگلستان جا کر انھوں نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس وغیرہ کتاب خازوں سے استفادہ کیا اور اپنے ارادے کی تکمیل کی۔ اس میں انھوں نے میور کے عائد کئے ہوئے تمام اعتراضات کا کافی و شافی جواب دیا اور ہر جگہ ممتاز اور سخیدگی کو برقرار رکھا۔ ان کا اندازہ اہتمام عالما نہ اور محققانہ ہے اور دلائل پر مبنی ہے۔ سر سید کی اس تصنیف کو علمی دنیا میں بڑی قدر و مترقبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ خود انصاف پسند اور غیر جا بند اور عیسائیوں نے اسے سراہا اور سر سید کی دلیلیوں سے اتفاق کیا۔ سر سید کو اس کام کی تکمیل اور اشاعت کی جتنی فکر تھی اس کا کچھ اندازہ ان کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو اس سلسلہ میں انھوں نے محسن الملک کو لکھا تھا اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کر دنیا کافی ہوگا:

"ان دونوں قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ

رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی نافعیاں دیکھ کر دل کیا ب
ہو گیا اور مضموم ارادہ کیا کہ آنحضرت کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا
کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق
ہو جاؤں تو بلا سے یہ

سرسید نے اپنی اصلاحی تحریک کے ترجمان کے طور پر ۱۸۰۷ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس مرحلہ میں انہوں نے انگریز صفات کا راستیل (STEELE) اور ایڈین (EDIN) کی قائم کی ہوئی روایات کی پیروی کی ان حضرات نے پہلے لندن سے ۱۸۰۹ء میں ٹیٹلر اخبار جاری کی تھا پھر ۱۸۱۱ء میں اسپیکٹر (SPECTATOR) نکالا اور ان کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں کی اصلاح معاشرت کا کام کیا۔ تہذیب الاخلاق سے بھی سرسید نے یہی کام لیا۔ اگرچہ اس کی ایک حلقة کی طرف سے مخالفت بھی ہوئی لیکن اس کے باوجود عوام میں اس نے یہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ سرسید خود بھی اس کی مقبولیت سے بڑے سرور اور مطمئن تھے۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء کے ایک شمارے میں لکھتے ہیں:

”آج اگر ہم اپنی قسمت پر خنزیر ہیں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فضیل یہاں کی آمد آمد کی خوشیاں منا میں تو بھی زیبا ہے۔ جو کچھ اس سوا چار برس میں ہوا کیا ایسے قلیل زمانے میں اس کے ہونے کی ہم کو توقع تھی۔ تو یہ تو بہ، کیا ہم کو ایسی جلد ان ناچیز پر چوں سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی بوج مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بے خبر سورہی تھی تو قع تھی۔! ہماری قوم کی جو کچھ بداقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کی داروںے بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو سچرا دیا تھا۔ دل سچر ہو گئے تھے، دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ باختہ پاؤں سُست ہو گئے تھے۔ زندہ تھے پر مُردوں سے بدتر تھے، اُٹھنے بینیٹھنے، چلتے چھرتے تھے، پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی سخوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ بخوبی ہشمار ہو گئے وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے۔ یوں پر جان ہے۔ سچرا اگر جان نہیں تو جہاں نہیں۔ کچھ لوگ ہشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔“

سرسید کو قدم قدم پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر پنجری اور ملحد ہونے کا الزام

لگایا گیا اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ سے ان کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کئے گئے۔ لیکن سر سید کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور وہ ان تمام مخالفتوں سے بے نیاز اپنی موصن میں لگے رہے۔ انھوں نے شیخ عبدالقدار جیلانی، امام غزالی اور امام ربانی مجدد الف ثانی کی مثالوں کو اپنے سامنے رکھا اور ان سے فیضان حاصل کیا۔ ان بزرگان دین کو بھی اپنی مصلحت کو شششوں میں شدید مخالفت کا سامنا کرنے پڑا تھا۔ سر سید نے کبھی بھی تحمل نہ تبدیر اور لگن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ جلد ہی ان کی کوششیں بار آؤ اور ہونے لگیں۔ مہدوستانی مسلمانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ وہ سر سید کے مشوروں کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں قابل قبول سمجھنے لگے اور مسلم معاشرے میں بہتری کے آثار نایاب ہونے لگے۔

تعلیم

تعلیم کے میدان میں سر سید نے سطحی اصلاح کا بیڑا لٹھایا۔ اس کے لیے انھوں نے سائنسی فک سوسائٹی ہمہ مددن اینگلو اور ٹیل کالج اور محمدن ایجو کیشنل کانفرنس کو قائم کیا۔

سائنسی فک سوسائٹی

سائنسی فک سوسائٹی کا قیام ۹ ربیعہ ۱۸۶۳ء میں یہ علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ یہ علی گڑھ تحریک کے ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ سر سید کا یہ نظر یہ تھا کہ بہترین تعلیم وہی ہے جو مادری زبان میں دی جائے۔ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے برلن اور دین ایشن کی طرف سے والسرائے کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی تھی جس میں یہ ایسی یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا جس میں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے۔ جب محمدن اینگلو اور ٹیل کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس اسکیم پر عل در آمد کا کام کالج کے اردو سیکشن کو سپرد کیا گیا۔ اردو کو ذریعہ تعلیم ننانے کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان علوم پر کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ چنانچہ سائنسی فک سوسائٹی نے ان علوم پر انگریزی کی کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اس کام کی تمام طبقوں کی طرف سے پذیرائی ہوئی۔ سوسائٹی کے مقاصد حسب ذیل تھے:-

- ۱۔ ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں

ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

- ۲۔ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کتاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے ہم پہنچانا اور چھاپنا۔
- ۳۔ سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

اس ایکیم کے تحت تقریباً چالیس کتابوں کے اردو تراجم شائع ہوتے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ تاریخ ایران مصنفہ سرجان مالکم۔

۲۔ تاریخ چین۔

۳۔ تاریخ ہندوستان - از الفتن۔

۴۔ رسالہ چیالوجی مصنفہ جان فلپس۔

۵۔ رسالہ علم فلاحت مصنفہ لاہی۔

۶۔ رسالہ علم طبیعت مصنفہ جے جے گرین۔

۷۔ رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنفہ بڑ۔

۸۔ کتب درباب علم سنسکرت از میکس ملر۔

۹۔ پولیکل اکونومی یعنی انتظام مدن مصنفہ سینیر

۱۰۔ رسالہ جرثیقیل مصنفہ المنس۔

سانسکریت سوسائٹی کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے با بائے اردو مولوی

عبد الحق لکھتے ہیں:

”دہلی کالج اور اس کی ورثیکر ٹرانسلیشن سوسائٹی (VERNACULAR TRANSLATION SOCIETY)

کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی

سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شائع کئے۔ یہ کام آج تک دشوار

نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہو گا جب تا اچھے مترجم دستیاب نہ

اور ترجموں کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں بختے یہ

ہندوستانی مسلمانوں کو ملکی اور بین الاقوامی حالات سے بانہر کھنے اور حکومت کو

ہندوستانیوں کے جذبات اور ریالیات سے واقع کرنے کے لیے سریدنے ہفت روزہ

اُخبار سینہ ٹیفک سوسائٹی ”جاری کیا۔ انگریزی میں اس کا نام علی گڑھ اسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا۔ یہ اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔ اس نوعیت سے کہ ہر صفحو پر دو کالم ہوتے تھے ایک کالم میں اردو کی عبارت ہوتی تھی اور دوسری میں انگریزی کی۔ اس کا پہلا شمارہ مارچ ۱۸۶۶ء کو شائع ہوا۔ مولانا حالی نے اس کی تفصیل حیاتِ جاوید، میں ان الفاظ میں بیان کی ہے:

” ۱۸۶۶ء میں سر سید نے سائنسی فک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسنی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے اخیر دسمبر تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتے دار نکلتا تھا، پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا اس اخبار کے ایڈیٹوریل کا اہتمام ابتداء سے اخیر تک سوائے ان آیام کے جب سر سید علی گڑھ میں نہیں رہے، انھیں کے ہاتھ میں رہا گواہیک مدت سے بہ سبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سر سید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا ان کو اس میں کسی طریقے آرٹسل کے لئے کاموں کم ملتا تھا بلکہ تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی ہتھم بالشان واقعہ پیش آتا تھا وہ ہدیثہ اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔۔۔۔۔ اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔۔۔۔۔ ایک خاص و صفت جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دلیسی اخباروں سے ممتاز ٹھہرا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دل آزاری رو نہیں رکھی ۔۔۔۔۔ ”

۲۔ محمدان اینگلوا اور بیتل کا بیٹہ

راجہ رام موہن رائے، کیش بچندر سین اور دیگر مصلحین کی کوششوں سے برادرانِ وطن پہلے ہی مغربی تعلیم کی طرف راغب ہو چکے تھے جس کے نتیجہ میں سرکاری ملازمتوں کے دروازے اُن کے لئے کھل گئے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں صدی کی ابتداء سے ہی یہ لوگ سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے گئے دوسری جانب مسلمان اس میدان میں بہت پیچھے رہ گئے۔ وہ انگریزی زبان اور مغربی تعلیم سے

متنفر تھے اور قدامت پرستی، مذہبی انتہا، پسندی اور جہالت کے جال میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ کسی بھی نئی بات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ نئے حالات سے مصالحت نہ کرنے کے سبب ان کی معاشری حالت بہت سی قسم توگئی تھی۔ بغاؤت میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں انگریز حکومت نے ان کی جاگیریں ضبط کر لی تھیں اور انگریزی ناقصیت کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے بند تھے۔ نیچے کے طور پر غربت اور افلاس کے بادل ان پر منڈلارے تھے پر یہ بڑی ناگفتہ صورتِ حال تھی۔ مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ سرید ان حالات کی طرف سے بڑے متفرکر تھے۔ مسلسل غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلم معاشرہ کی تمام بیماریوں کا علاج مغربی تعلیم میں مضر ہے۔

سرید سمجھتے تھے کہ مشرقی طرز کی تعلیم جو مدرسون اور مکتبوں میں دی جاتی ہے۔ وہ نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم کا معیار تھا سرید اس سے بھی مطلوب نہیں تھے ان میں جو نصاب رائج تھا اس سے مسلمانوں کے بنیادی مذہبی عقاید پر ضرب پڑتی تھی۔ لہذا حکومت کے زیر اہتمام اسکولی تعلیم سے قومی اتحاد اور وطن پرستی کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان کے خیال میں قومی تعلیم کو اس وقت تک فروع حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اہل وطن تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھیں نہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم کے مندرجہ ذیل مقاصد وضع کئے:

- ۱۔ انسان کے بنیادی اعتقادات میں استحکام پیدا کرنا جس کے لیے مذہبی حقوق کا علم ضروری ہے۔ اس کے لیے عقائد و سنت اور دلائل و براہین میں ہم آہنگی کا ہونا لازمی ہے۔
- ۲۔ اقامتی اداروں کو قائم کر کے شخصیت و کردار سازی کی تربیت کرنا۔
- ۳۔ اعلیٰ مدارج تک رسائیں اور جدید علوم کی تعلیم دنیا اور طلباء میں اعدل پسندانہ نقطہ نظر پیدا کرنا۔

اپنے انگلستان کے قیام کے دوران سرید نے وہاں کے تعلیمی نظام کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہ کیمیرج یونیورسٹی بھی گئے اور وہاں کے طریقہ تعلیم کو دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ذہن میں یونیورسٹی کے تعلیمی نظام کا خاکہ مرتب کیا۔ ہندوستان والپس آنے کے بعد انہوں نے آکسفورڈ اور کیمیرج یونیورسٹیوں کے طرز پر ایک ایسے ادارے کے قیام کے لیے اپنی کوششیوں کو تیزتر کر دیا جس کا انعام و اہتمام مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء

کو انہوں نے ایک مکمل تسلیل دی جس کا کام اُن اس باب کا جائزہ لیتا تھا جو حکومت کے قائم کر دے تعلیمی اداروں سے مسلمانوں کے مستفید ہونے میں مانع آرہے تھے۔ ان اس باب کا جائزہ لینے کے بعد مکملیٰ نے "محمد انیگلو اور نیل کالج فنڈ مکملیٰ" کے نام سے ایک اور مکمل تسلیل دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور علی گڑھ کو اس کے لئے منتخب کیا۔ اسی کے ساتھ سر سید کے ایک طویل اور کھن سفر کا آغاز ہوا۔ سر سید کی مخالفت "تہذیب الاخلاق" کے وقت ہی سے شروع ہو گئی تھی اور جب انہوں نے کالج قائم کرنے کے لیے چندہ کی اپیل کی تو مذہبی حلقوں کی طرف سے ان کی سخت ترین مخالفت شروع ہو گئی لیکن سر سید تو عزم و استقلال کے ایک پہاڑ تھے۔ انہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور تہی مایوسی کا شکار ہوئے بلکہ مخالفتوں اور تنقیدوں کے جلویں وہ اپنے مقصد میں آگے بڑھتے گئے۔ ابتداء میں انہوں نے ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء کو ایک اسکول قائم کیا۔ اس کے قیام کے ایک سال بعد سر سید نے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کا فیصلہ کیا اور جون ۱۸۷۶ء میں باعزت طور پر ریٹائرمنٹ لے لیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود کو کالج کی خدمت کے لیے وقف کر دیا کالج کے لیے چندہ کرنے کی خاطرا انہوں نے پورے ملک کا دورہ کیا انہوں نے خود بھی اپنی تمام دو کالج کو دے دی حتیٰ کہ اپنی کتابیں وغیرہ بھی فروخت کر دیں اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بھی چندہ میں دے دی۔ سر سید کا عزم و تحمل تمام مخالفتوں پر حادی آیا اور کالج نے جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں تہذیب الاخلاق میں جو مقامیں لکھے یا مختلف مقامات پر جو تقریبیں لیں، ان سے لوگوں کے دل بدلتے اور وہ سر سید کے اخلاص دلبے لوٹی کے قابل ہو گئے۔ اب انہیں مغربی تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا۔ انہوں نے مذہبی تعصب اور انگریزوں سے نفرت کی روشن کو ترک کیا۔ اس کے بعد سر سید کا کام آسان ہوا۔ ۸ جنوری ۱۸۷۸ء کو دائرائے ہند لارڈ لٹن (LORD LYTTLETON) کے ہاتھوں کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ابتداء کالج میں دو شعبے قائم کئے گئے۔ ایک شعبہ انگریزی جس میں عام تھاب کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی اور دوسرا شعبہ علوم مشرقیہ جس میں عربی، فارسی علوم والسنہ کے ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اس میں ایک گھنٹہ انگریزی زبان کے لئے وقف تھا۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ایم۔ اے۔ کالج ابتداء ہی سے سیکولر کردار کا حامل رہا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا تھا، لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ اس کے دروازے غیر مسلم طلباء کے لیے بھی ہیئت

کھلے رہے اور طلباء و اساتذہ میں کبھی بھی ہندو مسلم کی تفریق نہیں کی گئی۔ ہندو طلباء کو ہمیشہ مسلمان طلباء کے مساوی حقوق حاصل رہے۔ سر سید ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی امتیاز کے قابل نہ تھے۔ ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لاہور میں انڈین ایسوی ایشن (INDIAN ASSOCIATION) کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

”کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے جو اپنے تین مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تین ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص اتھام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے متحقی ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بودھ کے یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ علی المعموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دو ایں آنکھ اور دوسرا کو با ایں آنکھ کہیں گے مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میکر صرف ایک آنکھ ہی ہوتی کہ اس حالت میں عدگی کے ساتھ ان کو اُس آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا یہ“

یہ الفاظ شخص ظاہرداری نہ تھے۔ یا ان کا مقصد صرف سامعین کے دل خوش کرنا نہیں تھا، بلکہ ان میں حقیقت پہنچا تھی۔ یہ سر سید کے دل سے نکلی ہوئی آواز تھی۔ سر سید جو کچھ کہتے وہ کر کے بھی دکھادیتے تھے۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ چنانچہ آج یہ حقیقت کسی سے پوچھنا نہیں کہ کالج کے ہیڈ ماسٹر ڈنیس (DUNNIS) تھے۔ ان کے بعد سکنڈ ماسٹر لال زیج ناتھ پرشا تھے جن کی حیثیت نائب ہیڈ ماسٹر کی سی تھی۔ ابتداء میں سات ممبر ان اسٹاف کا تقرر ہوا جن میں دو غیر مسلم بھی شامل تھے انہیں ایک شری جادو چندر چکرورتی تھے جو ریاضی کے پروفیسر تھے اور دوسرے شری شوشنکر تھے جو سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ جادو چندر چکرورتی نے کچھ دنوں قائم مقام چبر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ کالج کی مجلس منظمه میں بالائیں ارکان تھے جن میں سے چھ ہندو تھے۔ ۱۸۸۴ء میں طلباء کی مجموعی تعداد ۲۶ تھی جن میں ۸۰ ہندو طلباء تھے۔ ہر سال اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا تا آنکھ ۱۸۹۵ء میں ۵۶۵ میں سے ہندوؤں کی تعداد ۱۰۹ ہو گئی۔ کالج کے پہلے

گز بحوث ایک ہندوالتوری پر شاد تھے۔ اسی طرح سب سے پہلے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے والے بھی ایک ہندو انبان پر شاد تھے۔ سنسکرت کو ابتداء ہی سے شاہنشاہ کیا گیا تھا۔

محمد ان ایجوکیشنل کانفرنس

سریں نے ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں محمد ان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس نے علی گڑھ تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرانے کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس کے سالانہ جلسے ہوتے جس میں ہندوستان کے کونے کونے سے مسلم دانشور جمع ہوتے اور عوام کو تعلیم کے جدید تقاضوں سے آگاہ کرتے اور مغربی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے۔ اس سے قبل اگرچہ محمد ان اوزٹیل کالج قائم ہو چکا تھا اور تیزی سے ترقی کے منازل طبعی کر رہا تھا اس کے باوجود سریں نے محسوس کیا کہ مسلم عوام میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک کالج کافی نہیں ہے۔ ہذا انہوں نے ایک ایسی فعال اخوب کی ضرورت کو محسوس کیا جو ملک گیر پیمانہ پر مسلم قوم کی تعلیمی ضروریات کی کفالت کر سکے۔ اس کے سالانہ جلسے ملک کے مختلف مقامات پر ہوتے جن کا بنیادی مقصد تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب کا جائزہ لینا اور ان کو دور کرنے کے لیے اقدامات تجویز کرنا تھا۔ اسی کے ساتھ ان اقدامات کا تجزیہ کرنا بھی تھا جو سال کے دوران اس سمت احتکارے گئے تھے۔ نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ کے زمانے میں اس کے سالانہ اجلاس لاہور، کلکتہ، مدراس، بمبئی، ڈھاکہ اور رنگوں جیسے دور دراز مقامات پر ہوئے۔ ان میں جو تباہی منظوظ کی جاتی تھیں وہ صرف مسلم رہنماؤں کی دورانیتی و دور بینی کی غمازوں کرتی تھیں بلکہ علی گڑھ تحریک کو وسعت اور ہمہ گیری بھی عطا کرتی تھیں۔ محض ہر ہی عرصہ میں کانفرنس کو توقع سے کہیں زیادہ کامیابی نصیب ہونے لگی۔ اس نے حکومت کی توجہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی طرف مبتدل کرائی۔ بہت سے معاملات میں حکومت نے بھی ہمدردانہ روایہ اپنایا۔ اس کے اجلاسوں کی کارروائیاں شائع ہوتیں اور وہ تمام تقاریر، خطبات اور نظمیں وغیرہ بھی شایع ہوتیں جو ان میں پڑھی جاتیں۔ اس طرح سیاسی، سماجی اور تعلیمی اہمیت کے ساتھ ان کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہو گئی۔ کانفرنس نے ۱۹۱۰ء کے اپنے ناگپور اجلاس میں مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز منظور کی۔ یہ ایک تاریخ ساز قدم تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کو نئی سمت عطا کی۔ اس نے الگ الگ کاموں کے لیے مختلف

شبے اور مکیٹیاں قائم کیں۔ ان میں سے ایک مکیٹی، ترقی اردو مکیٹی، تھی جس نے بعد میں خود مختار ہجمن کی حیثیت حاصل کر لی اور راجہن ترقی اردو ہند، کے نام سے معروف ہوئی، اس نے اردو کی فقید المثال خدمات انجام دیں۔ مختصر یہ کہ کافرنس کی بدولت علی گڑھ تحریک کو وسعت، ہمہ گیری اور بڑی حد تک کا میابی نصیب ہوئی۔ سر سید تاجات اس کے سکریٹری رہے۔

اردو

اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں بھی علی گڑھ تحریک کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ سر سید نے اردو ادب کو نہ صرف نئے خیالات اور جدید موضوعات سے مالا مال کیا بلکہ اردو نشر کو ایک نیا اسلوب بھی عطا کیا جس میں سلاست، روانی، شیرینی اور مقصدیت ہے۔ وہ تحریر میں تفعیل، عبارت آرائی اور غیر ضروری لفاظی کے سخت مخالف تھے۔ وہ سادہ اور آسان زبان کے حامی تھے۔ ایسی زبان جس میں اپنے مانی الضمیر کو اس انداز سے ادا کیا گیا ہو کہ وہ مخاطب کے دل میں اتر جائے۔ نہ اس میں کسی قسم کا ابہام ہو، نہ الفاظ میں اشکال ہوا اور نہ جملوں کی ساخت میں پھیڈ گی۔ وہ ادب کے افادی پہلو کو سامنے رکھتے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

”جو لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرا دل کے دل میں پڑے۔ دل سے نکلے دل میں بیٹھے۔“

سر سید نے خود بھی اس طرزِ نگارش کو اپنایا اور دوسروں کو بھی اسی طرز کے اپنانے کا مشورہ دیا۔ اردو کی اس خدمت نے علی گڑھ تحریک کو تقویت سخنی، بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

”اگر سر سید نے علی گڑھ تحریک کو اپنی اردو نشر سے اور اردو نشر کو علی گڑھ تحریک سے مقصد و محکمی نہ دی ہوتی تو جدید اردو کو وہ پروپریتی نہ ہوتے جس کی بدلت نہ رکھتی جس نے اردو کو ان مخصوص دلبتاؤں (متلاطہ، لکھنؤ وغیرہ) سے نکال کر عام کیا جن یہاں اس طرح اسی روگی تھی جس طرح ملک کے باشندے ذات پات کے زندانوں میں مجبور و مقید تھے۔ سر سید کی دی ہوئی اردو نشر کا منشور یہ تھا۔ اب سے اردو کا دلبتان جغرافیائی حدود یا صنائع و بدارائع کا مینابازاً“

نہیں بلکہ زندگی، زمانہ اور علم و ادب کے تقاضوں اور تکلیفوں کا کھلا ہوا
بازارِ مصروف گا۔“

۱۸۳۰ء میں انھوں نے اردو قواعد پر رسالہ تالیف کیا اور اس میں عبارت کے لیے اعراب اور اصول و قواعد مقرر کئے۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا واحد کام ہے۔ انھوں نے تحقیق و ترتیب متن کو بھی اعلیٰ معیار عطا کیا۔ ان کی مرتب کردہ آئین اکبری، تاریخ فیروز شاہی اور ترجمہ جہانگیری ترتیب متن کے سلسلہ میں آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آئین اکبری شیخ ابو الفضل علاءی کی تالیف ہے اور شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ کے بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کے متعدد اڈیشن دستیاب تھے، لیکن ان میں صحت متن کا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ سر سید نے اسے از سرتو ترتیب دیا اس میں انھوں نے متن کی صحت کا خاص اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ متن سے متعلق مغل زیورات کی تصویریں، بادشاہی خیمه گاہ اور اس عہد کے چهلدار اور چھولدار درختوں کی تصاویر وغیرہ بھی شایع کیں۔ اس طرح اصل تصنیف کی افادیت میں اضافہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے ”تاریخ فیروز شاہی“ کو بھی ترتیب دیا۔ اس میں بھی انھوں نے صحت متن کی طرف خصوصی توجہ دی، اس پر ایک مبسوط مقدمہ قلم بند کیا اور اس کے مؤلف فیض الدین برنسی کے حالاتِ زندگی لکھے اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ اس زمانے تک شاہان ہند پر حکومی کتابیں دستیاب بھیں ان پر بھی بھر پور روشنی ڈالی۔

سر سید کا ایک اور اہم کارنامہ اردو ٹاپ کو روایج دنیا تھا۔ سر سید لیتھیو گرافک چیپائی کے قائل نہیں تھے۔ انگریزی کی طرح اردو کے لیے بھی وہ ٹاپ کو راجح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اخراج میں ٹیفک سوراٹی اور بعد میں رسالہ تہذیب، الاحلاق ٹاپ، ہی میں جاری کئے غالباً اسی سے فیضان حاصل کر کے — مولانا ابوالاکلام آزاد نے بھی ”الہلال“ اور ”البلاغ“ کے لیے ٹاپ ہی کو ترجمہ دی۔

سیاست

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک تعلیمی تحریک بھی جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشانہ ثانیہ کرنا تھا۔ ابیوسی صدی عیسوی دیگر مشرقی مالک کی طرح ہندوستان کے لئے بھی عہد تغیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم طرز حیات اور انداز فلک ختم ہو رہے تھے اور انکی جگہ نئے اندازانہ جدید خیالات جنم لے رہے تھے۔ سر زمین ہند کی نئے طرز پر آ بیماری کی جا رہی تھی ہندوستان

کی دیگر اقوام نے ان تبدیلیوں کو خوش آمدید کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسلم قوم اس طرف متوجہ ہیں تھی۔ وہ خواہ فقلت میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ فخر علی گڑھ کو حاصل ہے کہ مسلمانوں کو اس سے بیساار کرنے اور مسلم معاشرہ کے احیا کی تحریک کا آغاز اسی سرزین سے ہوا۔ اس طرح علی گڑھ نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں کلیدی روٹ ادا کیا۔

< اپنے اکثر ہندو ہم عصروں کی طرح سریں نے بھی اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں ہندوستانی باشندوں کی فلاج و بیبود کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف نفرت کو اپنے قلوب سے نکالیں، انگریزی حکومت کی مخالفت ترک کریں اور اپنی تمام ترقیاتیں تعلیم کے فروغ کے لئے صرف کر دیں۔ اسی طرح وہ ترقی یا فتح مغربی مالک کے برابر آسکیں گے۔ سریں کے خیال میں یہ حکمت علی مسلمانوں کے لئے سبے زیادہ ضروری تھی اس لئے کہ وہ تعلیمی میدان میں دیگر ہندوستانی اقوام سے کم از کم ڈیڑھ سو سال پیچھے تھے۔ انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر مسلمان پھر سیاست میں ملوث ہو گئے تو انھیں وہی روز بردیکھنا پڑے گا جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ مزید یہ کہ سیاست میں داخل ہو جانے کے بعد ان کی تعلیمی سرگرمیاں پس پشت پڑ جائیں گی۔ ہنر اور مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے سخت مخالف تھے کہ بد قسمی سے ہمارے بعض موئیین نے سریں کے ساتھ اتفاق نہیں کیا اور ان کے سیاسی نظریات کو منع کر کے پیش کیا ہے۔ انکو انگریزوں کا خوشہ چیزیں اور انہیں نیشنل کانگریس کی مخالف بتایا ہے۔ ان پر یہ اسلام بھی اکثر لگایا جاتا ہے کہ کانگریس کی مخالفت میں جو کچھ بھی سریں کہتے تھے وہ انگریزوں کے ایسا پر کہتے تھے۔ خود ان کے معاصرین بھی اسی بدگمانی میں مبتلا تھے۔ حالانکہ ان کے خذالت کی کوئی اصلیت نہیں۔ اس قسم کی تمام غلط فہیاں بے بنیاد اور حقیقت سے بعید تھیں۔ سریں نے تو کسی سے مروب بھتے اور نہ ہی کسی کو اپنے ذہن پر سلطہ ہونے دیتے تھے خواہ وہ حکمران طبقہ ہی کبھی نہ ہو۔ وہ کالج کے انتظامی امور میں بھی حکومت کی بے جا مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ۸ رائست ۱۸۸۱ء کو سریں ممتاز علی کے نام ایک خط میں وہ نکھلتے ہیں :

" ہم ہندوستانیوں کی تمام مجالیں بے جان ہیں۔ یا تو ان میں کچھ کام نہیں ہوتا یا کسی یورپیں افسر کے ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں اور اس کے مقصد یا رائے کی تکمیل کا آہن جاتی ہیں۔ کیا ہم میں یہ قوت نہیں ہے کہ ہم اپنا کام اپنی رائے اور اپنی قوت سے چلادیں۔ ہم سے اور مژر کیس مصاحب ڈائرکٹر صاحب پبلک انٹرکشن سے

نہایت ناموافقت تھی۔ ملاقات اور صاحب سلامت بھی نہ ہوتی تھی۔ ہمارے تمام کاموں کے وہ بخلاف تھے۔ سبب صرف یہ تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ سینٹ فیک سوسائٹی اور مدرسۃ العلوم ان کے قبضہ میں ہو اور ہم صرف ان کے ہاتھ میں بطور ایک آئے کے ہوں۔ ہم نے نہایت استقلال سے کسی بات میں دخل دینے نہیں دیا۔ اور آپ اپنی رائے سے اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے کام چلایا اور میں اپنے دوستوں کو کوئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میکے بعد مدرسۃ العلوم کا جو کچھ حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضہ میں چلا جائے۔ جوی طرح یا جعلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔ لوگ عام فائدے کے کاموں میں حکام کے سامنے بھی اپنا رونق چاہتے ہیں مگر حقیقت میں اپنی عزت کھو ڈیتے ہیں ہم اس ضلع کے حکام کا بہت ادب کرتے ہیں، تمام جلسوں میں انھیں کو افسر نباتے ہیں انعام ان ہی کے ہاتھ سے تقیم کر داتے ہیں۔ مگر ہمارے کام میں ان کی ایک نقطہ بھی مداخلت نہیں ہوتی۔[↑]

اسی طرح ۱۸۹۱ء میں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں انخوں نے ان خلاف کا اظہار کیا تھا:

”ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ ذکرنی چاہیئے اور اگر ہم میں سیف رسید کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جائز پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔“[↑]

جو شخص اپنی اور اپنی قوم کی خودداری کا اتنا زبردست حامی ہو، اور اپنے معاملات میں کسی طرح بھی حکماں طبقہ کی مداخلت کو برداشت نہ کر سکتا ہو اس کے متعلق یہ کس طرح یا در کیا جاسکتا ہے کہ وہ کانگریس کی مخالفت انگریزوں کے ایسا در پر کرتا تھا۔ دراصل سر سید یہ صحیت تھے کہ مسلمانوں کے لئے سیاست میں حصہ لینے کے لیے فناساز گار نہیں ہے۔ اس سے ان کو بجاے فائدہ کے نقصان ہو گا۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کی کسی بھی سیاسی تحریک سے وابستگی کے مخالف تھے۔ پنڈت نہرو نے سر سید کے مشن کی رو جو سمجھا۔ وہ ان کی تحریک کو صحیح سمعت بروقت قدم تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس کی وکالت کرتے ہوئے وہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں، ”انخوں نے اس تعلیم کی طرف اپنی قوم کو راغب کرنے کے لیے ساری قوتوں پر

کر دیں۔ لیکن وہ دوسری سکتوں کی طرف سے بھی ان کا ذہن بالکل ہٹانا نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو جمود اور پس دشی کے احوال سے نکانا ڈرامشکل کام تھا۔ ہندو بورڑواڑ ہبیت نے نئی قومیت کا جو تصور پیش کیا تھا، اس نے سریسید کو یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے اس ہبیت کی زبردست مخالفت کی ہندو لوگ جو مسلمانوں سے مغربی تعلیم کے میدان میں نصت صدی آگے ہتھے۔ وہ حکومت پر تنقید کرنے میں اپنے وقت کو ضایع کر سکتے تھے۔ لیکن مسلمان اس قسم کے تفیض اوقات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ سریسید نے تعلیمی معاملات میں حکومت سے تعاون کی حکمت عملی کو اپنایا۔ وہ اپنی قوم کی ذہنی ناقابلگی کے عالم میں سیاست میں حصہ لینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ مغربی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو راغب کرنے کا سریسید کا عالم صحیح سمت ایک اہم قدم تھا، اس کے بغیر مسلمان جدید طرز کی ہندوستانی قومیت کی تغیری میں موثر کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تاریخی اور نظریاتی طور پر نئے بورڑوان نظام کے لیے تیار نہ تھے اس لیے کہ ہندو حضرات کی طرح انہوں نے اس طرف کجھی توجہ ہی نہیں کی تھی۔ سریسید کی سرگرمیاں اگرچہ ٹری معقول نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ صحیح سمت ایک عظیم انقلاب کی رہنمائی کر رہی تھیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک ایک ہمہ جہتی تحریک تھی جس نے زندگی کے تمام روشن پہلوؤں کو اپنے اندر سمیا تھا۔ بہت سے معاملات میں یہ پندروں میں صدی عیسوی میں یورپی نشادہ ثانیہ سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس تحریک کا آغاز اہمیتی ہفت شکن، مایوس کن اور نامساعد حالات میں ہوا تھا۔ راستہ ڈرامپریچ پ سنگلاخ تھا اور ہر موڑ پر بلکہ ہر قدم پر تھی رکاوٹیں پسیدا ہو رہی تھیں لیکن سریسید نے ہفت نہیں ہاری۔ انہوں نے تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ مخالفتیں برداشت کیں اور اپنے متعلق کفر کے فتویٰ کو خنده پیشیاں سے قبول کیا۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ منزل انہیں قریب نظر آنے لگی۔ کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چوپے۔ انہوں نے محض اپنی قوتِ بازو کے بیل پر یہ طویل سفر شروع کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس عہد کی تمام عظیم شخصیتیں (مثلاً مولا ناجالی، علامہ شبیلی، مولوی ذکاء اللہ، محسن الملک، دقا الملک) مولوی سعیع اللہ اور نواب مزم الڈخاں شروعی وغیرہ) ان کے ساتھ ہوتی گیئیں۔ بقول شاعرہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارروائی بنا گیا

ان لوگوں نے سر سید کی دستیگیری کی اور دامنے، درمے، سخنے ان کی مدد کر کے ان کے سفر کو آسان کیا اور منزل سے ہم کنار ہونے میں مدد کی۔ مخصوصی ہی مدت میں اس تحریک نے مسلم معاشرے میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو کورانہ تقلید، جہالت اور بے حسی کی تاریکیوں سے بکالا اور ذہنی بیداری، جدید تعلیم اور اپنے گرد و پیش سے باخبر رہنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی اور روشن صبح کے طلوع ہونے کا پیغام سنایا۔

دیوبند اور علی گڑھ

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۵ء کو عمل میں آیا۔ ۱۸۷۵ء کے بعد علماء نے اپنی کوششوں کو میدانِ جنگ سے ہٹا کر مدرسون اور مکتبوں کی طرف منتقل کر دیا۔ دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم ناٹوری اور سر سید احمد خاں میں بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ دونوں کا مشن ایک تھا۔ دونوں نے مسلم قوم کی اصلاح کا بڑا اٹھایا۔ دونوں کے دل میں مسلم قوم کا درد تھا۔ لیکن دونوں کے نظریات اور طریقہ کار میں زبردست اختلاف تھا۔ مولانا مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے صرف مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے خالص مذہبی تعلیم کے ذریعہ اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ حکومت کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی پر بھی سختی سے کاربند رہا۔ اس کے برخلاف علی گڑھ نے مغربی تعلیم اور دینیات کے اشتراک سے حصولِ مقصد کی کوشش کی اور حکومت وقت سے اتحاد و تعاون کی پالیسی کو اپنایا۔ اس طرح نظریات میں فرق اور طریقہ کار میں اختلاف کے باوجود دونوں نے ملک ملت کی بیش بہادر خدمات انجام دیں اور یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران ہندوستان کی پوری سیاسی فضا پر فاضلین دیوبند اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حضرات چھائے رہے جمعیتہ علماء جو مذہبی اور سیاسی جماعت سختی اس پر فضلائے دیوبند کا غالبہ تھا اور کانگریس اور مسلم لیگ جو خالص سیاسی جماعتوں تھیں ان کی قیادت فرزندان علی گڑھ کر رہے تھے۔ فضلائے دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدینی، مولانا شبیر احمد غمامی، شیخ التفسیر مولانا عبد الحق مدینی، مولانا حفظ الرحمن، سجحان الہند

مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ اور مولانا سید محمد میراں جیسے اکابر کے نام سر قہرست نظر آتے ہیں۔ فرزندان علی گڑھ میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سید محمود، تعددق احمد قاں شروانی مولانا حضرت مولانا میں، خواجہ عبدالجید، میر برکت علی خاں، رفع احمد قدوالی وغیرہ حضرات نے کانگریز میں رہنا یا نہ رہنا کردار ادا کیا۔ مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء میں کانگریز کے صدر ہوئے، انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو جنرل سکرٹری مقرر کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ محمد عبداللہ، بخشی علام محمد علام محمد صادق جیسے فرزندان علی گڑھ نے بھی ملک و قوم کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ علماء دیوبند سریں اور ان کے قائم کردہ کالج کے مخالف رہے ہیں۔ غالباً یہ بات کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے علماء عام طور پر سریں کے مذہبی اعتقادات سے متفق نہیں تھے۔ ان میں دیوبندی علماء کی کوئی تخفیض نہیں تھی۔ دیگر مکاتب فکر کے علماء بھی سریں کے مذہبی افکار کو حق بجانب نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان کے رفقاء میں محسن الملک جیسے راسخ العقیدہ حضرات بھی سریں کے مذہبی اعتقادات سےاتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ کالج کے ناظم دینیات بانی دارالعلوم دیوبند اور سریں کے مذہبی اعتقاداً کے زبردست مخالف مولانا محمد قاسم ناتوتی کے دام بھی رہے ہیں۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں دونوں اداروں کے فرزندوں نے شانہ لشانہ کام کیا اور ملک کو علامی سے آزاد کرنے کے لیے تن من وطن کی بازی لگا دی۔ جمیعتہ علماء کا بارہواں اجلاس جون ۱۹۴۶ء میں جونپور منعقد ہوا۔ اس کی صدارت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے کی۔ استقبالیہ مکتبی کے صدر خواجہ عبدالجید تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں علی گڑھ اور دیوبند کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کی کوشش کی اور حضرت مدنی کی خدمت میں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا:

”آج علی گڑھ کا ایک تعلیم یافتہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی خدمت میں عقیدت کے بھول پیش کرتا ہے“

اس طرح جہاں تک ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کا تعلق ہے دونوں مکاتب کے فرزندوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں تھا بلکہ ان میں ہر طرح کا تحدیث اور اتفاق رائے ملتا ہے۔ البتہ

اتنا ضرور ہے کہ فرزندان دیوبند نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا اور اپنی جدا گانہ جماعت بنانے کا رس کے پسیٹ فارم سے ملک و ملت کی خدمت کی جب کہ ناضلان علی گڑھ نے اس فرم کی کتنی نظم کو ضرور نہیں سمجھا اور دوسری سیاسی جماعتوں سے منسلک ہو گئے۔

سو سیدا اور جمال الدین افغانی

انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے یہ دونوں دانشور اپنے مقاصد میں کیا تیت کے باوجود جدا گانہ نظریات، خیالات اور طریقہ کار کے حامل تھے۔ دونوں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بات یافت اور شاندار ماضی کے احیاء کے خواہاں تھے۔ ان کے نظریات میں ایک بات مشترک تھی اور یہ کہ دونوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اسلام ایک فعال مذہب ہے اور اس میں سماج کی موجودہ و آئندہ ضروریات کو پورا کرنے کی بھروسہ صلاحیت موجود ہے لیکن سرید ایک عملی انسان تھے اور اپنے خیالات کی عمارت کو ٹھوس حقائق پر تغیر کرتے تھے جب کہ جمال الدین افغانی ایک تظریقی انسان تھے اور اپنی سرگرمیوں کو محض عمومی اور اصولی باتوں تک محدود رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہی اتحاد اسلامی کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی ناکامی کا راز اس تلغیت میں مضر تھا کہ یہ تحریک اسلامی مالک کو درپشیں مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی کیونکہ یہ مسائل ہر ملک میں مختلف نوعیت کے تھے۔ علامہ اقبال کی رائے میں جمال الدین افغانی کے لئے یہ بات کہیں زیادہ اچھی ہوتی کہ وہ اپنی تمام ترقوت اور ذہنی صلاحیتیں یہ ثابت کرنے میں لگادیتے کہ اسلام مکمل نظام حیات ہے۔ اگر انہوں نے اس طرف توجہ دی ہوتی تو یقیناً علامہ اقبال "عالم اسلام آج بہت زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتا" سرید چونکہ عملی انسان تھے، اس لئے انہوں نے منزل کو پایا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور جب ان کے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو انہیں یہ اطمینان تھا کہ ایک انقلاب رو نہ ہو گا ہے جو روشن متنقبل کی خبر دے رہا ہے۔

علی گڑھ تحریک سو سید کے بعد

علی گڑھ تحریک کا دوسرا دور سرید کے انتقال کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۱۹۲۰ء میں کالج کے یونیورسٹی میں تبدیل ہو جانے پر اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ اس دور کی تاریخ یونیورسٹی کے قیام کی جدوجہد اور کالج کی خود مختاری کے تحفظ کے لیے کوششوں

کی تاریخ ہے۔

تیسرا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم پختہ ہو جاتا ہے۔ اس دور کے علی گڑھ کی سرگرمیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کبھی بھی سیاسی تحریک نہیں رہی ہے۔ اس نے اپنے فرزندوں پر کسی مخصوص سیاسی نظریے کو مسلط نہیں کیا بلکہ یہاں ہر شخص کو خود اپنے سیاسی خیالات اور نظریات دفع کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی بتتی ہے۔ وجہ ہے کہ یہاں ہر مکتب فکر کے سیاسی لیڈر پیدا ہوئے۔ ان میں اعتدال پسند بھی تھے اور انتہا پسند بھی ایک قومی نظریے کے حامل بھی تھے اور دو قومی نظریے کے حامی بھی۔ ان میں کیونٹ بھی تھے، کانگریسی بھی اور مسلم لیگی بھی۔ چنانچہ جہاں اس نے محمد ایوب خاں، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشر جیسے لیڈر پیدا کئے وہی مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین موسیٰ، ڈاکٹر سید محمود، سید حسین، رفیع احمد قدوالی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ عبداللہ غلام محمد صادق، سید میر قاسم، عبد الغفور، پروفیسر محمد جسیب، تصدق احمد خاں شروانی اور عبد المجید خواجہ جیسے رہنماء بھی پیدا کئے جنہوں نے اپنے وطن عزیز کی بیش بہادری اور خدمات انجام دیں اور جدوجہد آزادی میں قابو پر رول ادا کیا اور مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کا سینہ پر ہو کر مقابلہ کیا۔ علی گڑھ سے کبھی کبھی لغوشیں بھی سرزد ہوئی ہیں جو ایک بالکل قدرتی امر تھا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ علی گڑھ ہر مرحلہ اور ہر مورپر وقت کی کسوٹی پر پورا ترایے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہاتا گاندھی کی اپیل کو لبیک کہتے ہوئے میں سو طالب علموں کے ساتھ محمد ایشیگلو اور ٹیلیں کالج سے ترک تعلق کر کے عدم تعاون تحریک میں شامل ہو گئے تھے یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس سے قبل بارہ سو ہندو یونیورسٹی کے طلباء گاندھی جی کی اسی عدم تعاون کی اپیل کو ٹھکرائیکے تھے۔

علی گڑھ تحریک بتیادی طور پر ایک تعلیمی اور ثقافتی تحریک بھتی۔ اس نے جدید تعلیم کی مدد سے اپنے طلباء میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا کی۔ اور ان کے ذہن کو بالیدگی بخشی ہے۔ ہر ایک معاشرے میں مختلف قسم کی قومیں کار فرما ہوتی ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی، معاشی، اور مذہبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اپنے افراد کی ذہنی پرداخت اور تعمیر نظریات میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ فرزانہ علی گڑھ بھی اس عالمگیر مسلمہ سے مستثنی نہیں رہے۔

علی گڑھ تحریک کا چوتھا دور موجودہ زمانے کو محیط ہے۔ جس کی ابتداء ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی سے ہوتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ڈاکٹر ساحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی

دائیں چانسلر شپ کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں علی گڑھ کے روں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

”مجھے دکھانی دیتا ہے کہ ہندوستانی قومی زندگی کی تعمیر میں اس ادارہ کا ایک اہم مقام ہے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ علمیہ اسلامیہ کے کام چھوڑ کر جس کے ساتھ میری ساری ذہنی اور روحانی نشونما وابستہ تھی، علی گڑھ نہ آتا۔ میں آنے پر اور یہاں تھہر نے پر صرف اس لئے اپنے آپ کو راضی کر سکا کہ مجھے خدا محسوس ہوا کہ یہاں اہم قومی کام کا ایک نادر موقع ہے۔“
کرتھے دامن دل می کشد کر جا ایں جاست

وہ کام ہندوستانی مذبرا اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے۔ یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک مستحده قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چا کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کتنا دل کش کام۔ یہ مختلف تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جز دوسرے جز کی رونق کو جمپکائے اور ایک حسین و حمیل کلُّ کی تشکیل میں مدد دے۔ اضافی کے سارے خزانوں کو، چاہے وہ کہیں سے آئے ہوں ہر ہندوستانی کی میراث بنا دینا کہ ہمارے ہی گم شدہ فعل ہیں۔ سب کو ایک مشترک اضافی کے احساس سے مالا مال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جدوجہد کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز طبقے کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رجادنیا کہ ان کا دین اور ہندوستانی زندگی کو صارخ زندگی بنانے میں ان کا مخصوص منصب یہاں پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالنے لئے ہیں اور خدمت کا ایک اور نادر موقع پیش کرتے ہیں۔ یہ بے وفا کی اور بے اعتنائی کا بہانہ نہیں

ہے۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؛ بہت بڑا کام ہے، بہت اہم کام ہے بل اس کام میں تنگ نظر اور تیرہ درونکتہ چیزیں عام طور پر بڑی مشکل پیدا کر دیتے ہیں۔ ہماری قومی زندگی میں فرقہ دارانہ کشاکش کی یاد سے ان تنگ نظر، کوتہ اندیش لوگوں کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنی غیر مہدردانہ غلط بیانیوں کو لوگوں سے باور کرالیں۔

عام پلک، ہمارے اخبارات، ہمارے ناکافی معلومات رکھنے والے پلک کا کن
ہمارے متعلق ہر بڑی چیز کو صحیح مان لینے پر کچھ آمادہ سے رہتے ہیں۔ اس آمادگی
کی وجہ میں سمجھتا ہوں گا سمجھنے کی وجہ سے اسے درست نہیں مان سکتا۔ ایک ہندوستانی
کی حیثیت سے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس غیر صالح طرز فکر کو اس نامدار کوشش
میں ناکام بنا دوں کہ وہ دفادر مسلمان شہروں کو یہ محسوس کرائے کہ وہ اپنے دیں
میں پرلیسی ہیں اس سے بڑی مایوسی اور شکستہ دلی پیدا ہوتی ہے جو تمام قوائے عمل کو
شل کر دیتی ہے۔ یہ نہ مسلمانوں کے لیے اچھا ہے، نہ ہمارے ملک کے لیے۔

ہمارے ملک کے سامنے ایک عظیم الشان کام ہے۔ ایک اچھی قومی زندگی
کی تعمیر کا کام۔ اس میں ضرورت ہے کہ قوت کا ایک ایک شہ خوشی خوشی اسی کام میں
لگادیا جائے۔ علی گڑھ جب طرح کام کرے گا، علی گڑھ جب اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ
ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں کی خدمت کے لئے جو پیش کش دے گا اس
سے متعدد ہو گا۔ ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ ہندوستان علی گڑھ کے
کے ساتھ جو سلوک کرے گا، اس پر ہاں بڑی حد تک اس پر منحصر ہو گی وہ شکل
جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔

علی گڑھ نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں ثابت رول ادا کیا ہے۔ اس نے ملک میں وسیع العلیٰ
فرقہ دارانہ ہم آہنگی، الفصاف، حررتی اور مساوات پر مبنی ایک بنئے معاشرے کی تعمیر و تشكیل میں مد
دی ہے۔ لیکن اس کا کام ہمیں ختم ہمیں ہو جاتا۔ آئندہ قومی زندگی میں اسے اب بڑی زیادہ اہم روک ادا کرنا ہے۔ اسے
سرسیداعظم کے نظریات۔ استدلال کی بالادستی، خنیر کی آزادی، خیالات کے انہصار کی آزادی،
سخت محنت، جاتی انسانی کے ہر گذشتہ میں غیر متعصبانہ اور سکول طرز فکر اور متعدد قومیت
کو آگے بڑھانا ہے (اسی میں ملک و ملت کے روشن مستقبل کی خانت ہے)

علی گڑھ اپنی قریب میں جس انتشار، خلفشار اور محاذی دور سے گزر رہے۔ اس سے علی گڑھ
کا ہر بی خواہ متفلکر و پریشان تھا۔ یہ کوئی وقتی ہر بختی جو آئی اور حلی گئی۔ بلکہ یہ ایک زبردست طوفان
تھا جو علی گڑھ کے شاندار ماضی کی عظیم روایات اور خوش آیندہ حال کو تہذیب بالا کر کے مستقبل کو تاریک بنانا
چاہتا تھا۔ یہ ایک باد صحراء میں جو یہاں کے خس و خاشاک تک کو اڑایجانا چاہتی تھی۔ اس کے آثار بہت
پہلے سے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ارباب بینیشن اور اہلِ یسیروں بہت پہلے سے اس کی پیش بینی

کر رہے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ کے ایک نامور فرزند اور مرد داتا اور یقول خود علی گڑھ کے "احماد کہف" میں سے ایک فرد پر وفیس رشید احمد صدیقی نے آج سے گیارہ سال قبل اس طوفان کی خیر دے دی تھی۔ ارکتوبر ۱۹۷۰ء کو سر سید مسیحور بیل لکھ رہی تھی ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"ہم اس وقت خاص سے ذہنی انتشار میں متلا ہیں جس سے ہمارے قوائے عمل مضمضل ہونے لگے ہیں۔ اس کے اسباب بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا احساس دائمات سب کو ہے۔ اس سلسلہ میں موٹی سی ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ آزادش کے ایسے وقت میں ہم کو رانپے اختلافات پر زور دینے کے بجائے متفقہ فیصلوں پر ہنجانا اور ان پر عمل کرنا چاہیئے اس فتنے سے خاص طور پر بچنا چاہیئے کہ کون امام ہو گا؟ اور کون مفتکدی؟ ورنہ اس کا انجام یہ ہو گا کہ ہم میں سے کوئی امام رہے گا نہ مقتدی بلکہ سب کے سب اپنے اپنے اغراض یا ہم سب کا جرا چاہنے والوں کا ادنی سے ادنی قیمت پر غلام ہو جائیں گے۔ یہ کوئی شرعاً مقولہ نہیں تصنیف کر رہا ہوں بلکہ" ہوتا ہے شب و روز تماشام رے آگے" آپ کے بھی آگے!

اس صاحب بعیرت نے نہ صرف اس طوفان کی پیش بینی کی اور برادران علی گڑھ کو اس سے خبردار کی بلکہ اس سے محفوظ رہنے کے طریقے بھی سمجھائے تھے۔ اس نے ایک حاذق طبیب کی طرح قوم کی بناضی کر کے نہ صرف مرض کی تشخیص کی بلکہ اس کے علاج کے لئے لنسخہ بھی تجویز کیا۔ انھوں نے کہا:

"ہمارا مقصد علی گڑھ مسلم یو نیورسٹی میں تعلیم، تربیت اور تہذیب کا ایسا مناسب و مؤثر انتظام کرنا ہے جو ملک میں ایسے لائق اور حوصلہ مندرجہ ان پیدا کرنے میں معین، ہجے جو اس کی ترقی اور ناموری کا باعث ہوں۔ بالفاظ دیگر وہ اچھے مسلمان اور اچھے ہندوستانی ہوں۔ یہ کام جتنا بڑا اور اچھا ہے؛ تناہی زیادہ مشکل یعنی احساس داری اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا ہے۔ اس کے لئے اس درس گاہ کے ارباب خیار اساتذہ، اولڈ بوائز اور طلباء و طبیعے انہاک و اتحاد سے کام کرنا ہے۔ اس طرح وہ حکومت، ملک اور ساختی رہنے بننے والوں کا مکمل اعتبار اور تعادن حاصل کر سکیں گے۔ اس کا میابی کی شرط یہ ہے کہ ہم میں سے ہر فرد خلوص کے ساتھ اس کا ہتھیہ کر لے کر وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو کام میں لا کے گا، اپنے سے شاکی، دوسرے سے شاکی، زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ

ہے ان سب سے شاکر کرنا کچھ نہیں، کو مناسب کو، کبھی گر جانا، اکثر گر گڑانا، یہ سب چھوڑنا پڑے گا۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ایسی سوسائٹی جو مسائل سے بری ہو کہیں اور کبھی کبھی وجود میں آئی ہے؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف اوقات و حالات میں مائر کی نوعیت تعداد اور مقدار میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔“

اس کا طریقہ کاراخنوں نے یہ تجویز کیا:

”میرا خیال ہے کہ ارباب اختیار، اسٹاف، اولڈ بوائز اور طلباء میں آزاد اور بامقصد تبادلہ خیال کے لئے زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرنے کے لیے ہم کو ایک مستقل اپنا ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ غلط فہمی، یا یوسی، یزیاری اور خود غرضی کو دور کرنے اور تازہ دم ہو کر کام کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ متعلقات اصحاب مناسب ماحول میں، منتخب حیثیت سے باضابطہ طور پر، خلوص اور عزم صمیم کے ساتھ اکٹھا ہوں۔ کمیٹی یا کانفرنس کے طریقوں کی پابندی کرتے ہوئے اعلیٰ سطح پر بحث مباحثہ کی مدد سے متفقہ فیصلوں پر پہنچنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے لئے خاص طور پر اس نوعیت کے ایک نمائندہ ادارے یا سلیکٹ کمیٹی کا قیام مفید اور مناسب ہوگا۔ اس سے ہم کو اپنے مسائل پر آزادی اور اعتماد کی فضائیں صحیح خطوط پر سوچنے اور عمل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح کی کمیٹی ہماری رہنمائی کرنے کے علاوہ ہماری بہت افزائی کا بھی موجب ہوگی اور وہ خلوص اور حوصلہ پیدا کرنے میں معین ہوگی جو اس ادارے کے لیے ازلیں ضروری ہے۔“

”میرا عقیدہ ہے کہ فرد یا جماعت اپنے مقاصد میں اسی وقت کا میاب ہوتی ہے جب وہ اپنے روزمرہ کے فرائض کو دچپی اور ایمانداری کے ساتھ اعلیٰ کارکردگی کے مطابق انجام دینے کی اہلیت پیدا کر لیتی ہے۔ اس اہلیت کے پیدا کرنے کے لیے مسلسل محا سبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد اور اقوام کی زندگی میں انقلاب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کے قول و فعل میں مطابقت ہوتی ہے جس کا عام فہم تصور یہ ہے کہ ہم ان عادتوں کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں جو ہماری ترقی کے راستے میں مزاحم ہیں اور ان کی جگہ بہتر عادات و خصایل کو اپناتے کی

کو شش کریں۔ صحت متداد تعمیری انقلاب کی ایک پہچان یہ ہے کہ جہلات و محرقات سے رشتہ توڑا جائے اور مغذیات سے جوڑا جائے۔ اعلیٰ ذہنی انقلاب بہتر تبدیلیوں کے امکانات کو روشن کرنے سے عبارت ہے مگر وہ بے شمر ہتا ہے اگر وہ خارجی احوال میں بہتر تبدیلیوں کی شکل میں رونما نہیں ہوتا۔ غالباً آپ کو اس سےاتفاق ہو گا کہ ہمارے آج کے حالات جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ کسی برے ذہنی انقلاب کی نشاندہی نہیں کرتے۔ آفاقی ذہن صرف ادعائے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا وجود آفاق میں سبے اہم مخلوق آدمی اور اس کے احوال کی درستی اور عمدگی سے ثابت ہوتا ہے۔ یونیورسٹی اعلیٰ اقدار کا سرچشمہ ہوتی ہے جن کے اساتذہ اور طلباء کے اعلیٰ فکر و عمل سے تہذیب و تمدن کی آبیاری ہوتی ہے۔ ہماری تہذیبی زندگی کی بہاؤ میں ہمارے آپ ہی کے خونِ جگر کی نمود ہو گی۔ آپ کی علمی دسترس، آپ کے سوچنے کا انداز، آپ کے رہنے سہنے، چال، ڈھال اور میل جوں کے ڈھنگ، ان سب کا ہماری تہذیبی زندگی سے بڑا گھر اعلق ہے۔ ان میں سے کسی میں ذرا بھی لغزش یا فردگذاشت دور رسم اور اندیشہ ناک تائج کا باعث ہو گی۔ خوب یاد رکھئے ہماری آپ کی قوم ہماری شاعری کے ردایتی عاشق کا دل نہیں رکھتی جو محبوب کی لغزش پا پر سرد ہننے کی قابل ہو۔

اس کے بعد انہوں نے اساتذہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”آپ اساتذہ سے بہتر یہ بات کون جانتا ہے کہ معلمی جتنا بڑا شرف ہے، اتنی ہی بڑی آزمائش بھی ہے۔ ہر عہد خصوصاً حیدر عہد میں جس طرح علوم کی مسلسل توسعہ و ترقی عمل میں آرہی ہے اس کے پیش نظر معلم کے فرانس میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کی ذمہ داری کے حدود دیس سے وسیع تر ہوتے چلتے جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے عالم کو ہر لمحے اور ہر قدم پر اس کا حساس ہوتا ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ نت نے چلنچوں کا مقابلہ درپیش رہتا ہے اور اسے اپنی ساری صلاحیتوں کو برکار لانے اور امتحان دیتے رہنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ معلم کی تقدیر لا منباہی آزمائشوں سے گزرتے رہتے ہے۔ اور اس کا شرف یہ ہے کہ وہ اپنی خدمت اور ریاست سے نو خیز اشلوں کو تعلیم و تہذیب نفس کے جملہ مدارج سے بخوبی گزرنے

میں مدد دے جو ان کو نہ صرف کارروائی علم و فن سے ہم عنان رکھنے میں معین ہو بلکہ اس کی رہنمائی کرنے کے قابل بنائے۔ طالب علموں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کا دوسرا مفہوم خود معلم کی تعلیم و تربیت اور اصلاح ہے۔ عام طور پر مسلم اور طالب علم کے رشتے کو چھوٹے اور بڑے کے رشتے سے تبیہ کیا جاتا ہے۔ لیکن دریں یہ رشتہ باہمی عزت، رفاقت و مساوات کا رشتہ ہے حفظِ مراتب کا الحاظ چھوٹے اور بڑے ہی کے درمیان تھیں رکھا جاتا بلکہ ان ساتھیوں کے درمیان بھی قائم ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے مساوی سطح پر ملتے ہیں۔ یونیورسٹی میں انسلوں کے درمیان خلیج (GENERATION GAP) کو تگ سے تگ تر کرتے ہیں۔ جو وسیلہ ہوتا ہے بالآخر اس کو پاٹ دینے کا۔ یونیورسٹی میں اس رشتہ کو استواری اسی وقت حاصل ہوگی جب ہم ہر الجہہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہیں گے۔ یونیورسٹی کے حدود میں خوب سے خوب تر فضای قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی فیکلٹیوں اور شعبوں میں، افامت گاہوں میں، گلیوں میں، کھیل کے میدانوں میں، باغوں اور شاہراہوں میں، گھروں میں، دفتروں میں زیادہ دلسوزی، تندہی اور پابندی سے کام کریں۔ ہماری تہذیبی ریاست میں سب سے بڑا درجہ اس کا ہوتا چاہیے جو متعلقہ فرائض اور ذمہ داریوں کی بجا آدھی میں سب سے زیادہ وقت اور محنت صرف کرے اور جان کھپائے۔ سر سید کے علی گڑھ میں سب سے بڑا امتیاز و اعزاز وہ ہے جو افس اور بے غیرتی سے نہیں بلکہ خدمت اور ریاضت سے حاصل کیا جائے!

میں الاقوامی سطح پر مسلم یونیورسٹی اور فرزندانِ علی گڑھ کے اہم روپ کی وضاحت کرتے ہوئے رشید صاحب نے کہا:

”..... عالمی سیاق و سباق میں اگر آپ ہندی مسلمانوں کے اس تہذیبی ادارے کے کردار کو متعین کرنا چاہیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہندوستان کے لئے ہندی مسلمانوں کی تہذیب، تمدن اور خیر سگانی کو جس حد تک علی گڑھ قابل قبول اور بارکت بنانے میں کامیاب ہوگا وہ ایک نونہ ہوگا باہر کے تمام مسلم مالک اور مسلمانوں کے لئے اس بات کا کروہ دیگر اقوام عالم کے درمیان کس طرح

ایک باعہت مقام حاصل کر کے عالم انسانی برادری کی تعمیر میں مدد دے سکتے ہیں؟

آخر میں انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم اپنے فرائض اسی وقت سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ جب عملی میدان میں سرگرم ہوں۔ ہم محض ہاتھ پر رکھے "منتظر فردا" رہیں تو اس سے مقصد حل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں علی گڑھ کے مستقبل کوتا بنا ک اور روشن بنانا ہے تو ہمیں عمل یہ ہم، جہد مسلسل اور دل سوزی و جگر کا وی سے کام لیتا ہو گا اور خود غرضی اور خود پرستی کو حصہ رکر بے غرضی، بے لوٹی، اتحاد و اتفاق، صبر و تحمل، باہمی موافقت اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنی ہو گی:

"میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ عشق اور عقل کی جس کشاکش پیہم سے آپ دو چار ہیں اس میں میں بھی گرفتار ہوں۔ اس سے نجات پائیں تو کیونکر؟ اس طرح کے لیکن اس سے زیادہ دل چسپ موقع پر غالب نے کہا تھا
کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو!

اس کا صحیح جواب علی گڑھ کی تاریخ اور روایات کے مطالعے سے حاصل ہو گا۔ جو میرے نزد میک عشق اور عقل کے درمیان مسلسل اور متصل توازن قائم کرنے اور رکھنے کی کوششوں سے عبارت ہیں۔ انہی کوششوں کی بدولت ہم نے بد لے ہوئے حالات میں سخت سے سخت مشکلات پر قابو پایا ہے اور بڑے سے بڑے سورکے سر کئے ہیں اور کبھی شکست بھی کھائی ہے تو عورت قائم رکھی ہے۔ لیکن عشق اور عقل کے درمیان "ترازو کی ڈنڈی" کو سیدھا رکھنے میں علی گڑھ اسی وقت کا میاب ہوا ہے جیسا کے دیوالوں اور فرزانوں نے اپنی صحفوں کو سیدھا اور استوار رکھا ہے اور کامل اتحاد کا ثبوت دیا ہے۔ علی گڑھ کے لئے یہ گھری محشر کی ہے اور ہم سب عرصہ محشر میں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے لئے وقت کی پیکار یہی ہے:

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

علی گڑھ کی جواب دہی میری، آپ کی جواب دہی ہے۔ آئیے مل کر بیٹھیں، مل کر سوچیں، مل کر فیصلہ کریں اور مل کر اس فیصلہ پر قائم رہیں اور نتیجہ کو خدا پر حصہ دیں۔ اس لئے کہ نتیجہ اور انجام کو خدا نے مکمل منتقل (TRANS FERRED SUBJECT) نہیں بلکہ مستقل یعنی (IMPERIAL SUBJECT) رکھا ہے جہاں ہمارا آپ کا دخل دور دو رہیں۔"